درس ۱

سُورۃ العَصر

لوازمِ نجات کے بیان میں قرآن حکیم کی جامع ترین سورۃ

نَحمدہٗ ونُصَلّی علٰی رَسولہِ الکریم
اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ○ ﴾

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب جو ہماری اس تحریک رجوع الی القرآن کی اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے' سورۃ العصر کا درس اس کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس نصاب میں قرآن مجید کے جو مقامات شامل ہیں ان کے انتخاب میں جو امور پیش نظر رہے ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ قرآن کے اہم مضامین (MAIN THEMES) کے ساتھ آپ کا تعارف ہو جائے۔ نیز قرآن حکیم کا اپنا جو مخصوص طرز استدلال ہے وہ بھی آپ کے سامنے آجائے۔ لیکن ان سے بھی بڑھ کر جو چیز پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ دین کا ایک صحیح اور جامع تصور سامنے آئے اور بالخصوص ہمارے جو دینی فرائض ہیں' یعنی بحیثیتِ مسلمان ہماری جو ذمہ داریاں ہیں' ان کا ایک واضح شعور اجاگر ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس منتخب نصاب کا نقطۂ آغاز "سورۃ العصر" کو قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ بعض دوسرے اعتبارات سے قرآن مجید کی دوسری سورتیں نہایت اہم ہیں۔ مثلاً قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کی حد درجہ جامع تعبیر کے اعتبار سے سورۃ الفاتحہ ہے' جسے بجا طور پر اُمّ القرآن اور اساس القرآن کہا گیا ہے۔

اسی طرح ایمانیات کے ضمن میں اہم ترین ایمان' یعنی ایمان باللہ' کے ضمن میں توحید اور خلوص و اخلاص کے موضوع پر سورۃ الاخلاص جس قدر جامع ہے وہ اس سے واضح ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ثلثِ قرآن قرار دیا ہے۔ یعنی یہ سورۂ مبارکہ ایک تہائی قرآن کے مساوی ہے۔ لیکن اس میں بھی ظاہر ہے کہ دین کا صرف ایک پہلو سامنے آتا ہے اور وہ ہے اعتقادی' اور اعتقادات میں سے بھی بالخصوص توحید---- لیکن سورۃ العصر کا معاملہ یہ ہے کہ دین کے جو عملی پہلو ہیں یعنی از روئے قرآن حکیم فوز و فلاح کے جو لوازم اور شرائط ہیں' ان کے بیان میں یہ سورۂ مبارکہ انتہائی جامع ہے۔ للذا اس منتخب نصاب کا نقطۂ آغاز سورۃ العصر ہے۔ آیئے اب اس سورۂ مبارکہ کا مطالعہ شروع کریں۔

ارشاد ہوتا ہے : ﴿وَالْعَصْرِ ۝﴾ "زمانہ کی قسم ہے۔" ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝﴾ "یقیناً تمام انسان بہت بڑے خسارے میں ہیں"۔ ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ "سوائے ان کے جو ایمان لائے۔" ﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ "اور انہوں نے نیک کام کئے۔" ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ﴾ "اور انہوں نے باہم ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی۔" ﴿وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾ "اور انہوں نے باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔"

فہم قرآن کے دو درجے

میں تمہیداً یہ بات عرض کر دوں کہ فہم قرآن کے دو درجے ہیں' جن کی طرف قرآن مجید ہی میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک ہے "تذکر بالقرآن" یعنی قرآن حکیم کے ذریعے نصیحت اخذ کرنا اور جو اس کا اصل سبق ہے وہ حاصل کر لینا۔ دوسرا ہے "تدبرِ قرآن" یعنی قرآن حکیم کی حکمتوں کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرنا۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؏

"قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان!"

تذکر بالقرآن کے اعتبار سے قرآن حکیم نہایت سلیس اور ایک نہایت آسان کتاب ہے۔ سورۃ القمر میں چار مرتبہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا : ﴿وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ ۝﴾ (آیات ۱۷'۲۲'۳۲'۴۰) یعنی "ہم نے اس قرآن کو

ذکر کے لئے' نصیحت کے لئے' سبق آموزی کے لئے بہت آسان کر دیا ہے' تو ہے کوئی جو اس سے نصیحت اخذ کرنا چاہے؟" لیکن جہاں تک تدبرِ قرآن کا تعلق ہے وہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کی گہرائیاں اتھاہ ہیں۔ لہٰذا اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرنے کے لئے واقعہ یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی وقف کر دے تب بھی وہ کبھی یہ محسوس نہیں کر سکے گا کہ اس نے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔

سورۃ العصر کے بارے میں چار بنیادی باتیں

اولاً ہم سورۃ العصر پر بطریقِ تذکر غور کریں گے اور اس کے لئے مناسب ہو گا کہ اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں چار بنیادی باتیں بطور تمہید ذہن نشین کر لی جائیں۔

ا۔ سب سے پہلی تمہیدی بات یہ کہ سورۃ العصر قرآن حکیم کی مختصر ترین سورتوں میں سے ایک ہے۔ یہ کل تین آیات پر مشتمل ہے۔ قرآن حکیم میں تین ہی سورتیں ہیں جو تین تین آیات پر مشتمل ہیں۔ ایک یہ سورۂ مبارکہ' دوسری سورۃ الکوثر اور تیسری سورۃ النصر ہے۔ تین سے کم آیات پر کوئی سورت مشتمل نہیں ہے۔

۲۔ دوسری تمہیدی بات یہ کہ نزولی ترتیب کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کی اولین سورتوں میں سے ایک ہے۔

نوٹ کیجئے کہ میں نے اب تک دو باتیں عرض کیں۔ پہلی یہ کہ یہ سورت قرآن حکیم کی مختصر ترین سورتوں میں سے ایک ہے' دوسری یہ کہ یہ سورت قرآن مجید کی اولین سورتوں میں سے ایک ہے' لیکن تیسری بات کے ضمن میں' میں اسلوب بدل رہا ہوں۔

۳۔ تیسری تمہیدی بات یہ ہے کہ میرے نزدیک یہ قرآن حکیم کی جامع ترین سورت ہے۔ میں نے جامع ترین سورتوں میں سے ایک سورت نہیں کہا' بلکہ یہ کہا ہے کہ یہ جامع ترین سورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کا موضوع انسان کی ہدایت ہے۔ یہ "الہدیٰ" ہے' انسان کے لئے رہنمائی اس کا اصل مضمون ہے۔ یہ فلسفے کی کتاب ہے نہ سائنس کی' نہ تاریخ یا جغرافیہ کی کتاب ہے' بلکہ یہ کتاب ہدایت ہے۔ "هُدًى لِّلنَّاس" ہے۔ انسان کی کامیابی کے جس راستے کی طرف یہ رہبری کرتی ہے اس کا

خلاصہ' اس کالبِّ لباب نہایت جامعیت کے ساتھ اس سورۂ مبارکہ میں موجود ہے۔ اس کی ایک تعبیر میں یوں بھی کیا کرتا ہوں کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پورا قرآن مجید ایک درخت کی مانند ہے اور یہ چھوٹی سی سورت اس کا بیج ہے اور جس طرح ایک بیج میں پورا درخت پنہاں ہوتا ہے اسی طرح سورۃ العصر میں پورا قرآن حکیم موجود ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل پر مشتمل ایک "اثر" ملتا ہے۔ اس اثر کو امام طبرانیؒ اپنی "معجم الاوسط" میں اور امام بیہقیؒ اپنی تالیف "شعب الایمان" میں لائے ہیں' جس میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ (ترجمہ) "حضرت ابو مزینہ دارمیؒ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے دو حضرات جب باہم ملاقات کرتے تو اس وقت تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے جب تک ان میں سے ایک دوسرے کو سورۃ العصر نہ سنالیتا۔ اس کے بعد ہی ان میں سے ہر ایک دوسرے کو (الوداعی) سلام کہتا"۔

ائمہ اربعہ میں سے امام شافعیؒ کا بعض اعتبارات سے بڑا اونچا مقام ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں ان کے دو قول ملتے ہیں' ایک وہ جو حافظ ابن کثیرؒ نے اس سورت کی تفسیر کے ضمن میں نقل کیا ہے' جس کی رو سے امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ (ترجمہ) "اگر لوگ صرف اس ایک سورت پر تدبر کریں' غور و فکر کریں' غوطہ زنی کریں تو یہ ان کی پوری رہنمائی اور کامل ہدایت کے لئے کافی ہو جائے گی"۔ دوسرا قول مفتی محمد عبدہٗ مرحوم نے اپنی تفسیر پارۂ عم میں نقل کیا ہے۔ اس کی رو سے امام شافعیؒ نے اس سورۂ مبارکہ کے متعلق فرمایا کہ (ترجمہ) "اگر قرآن میں ماسوائے اس ایک سورۃ کے اور کچھ بھی نازل نہ ہوتا تو صرف یہ سورت ہی لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کافی تھی"۔ جب ہم اس سورۂ مبارکہ پر غور کریں گے تو دیکھیں گے کہ واقعہ یہ ہے کہ انسان کی فوز و فلاح' اس کی نجات' اس کی کامیابی اور کامرانی کے جتنے لوازم ہیں' اس کی جتنی شرائط ہیں' ان کو نہایت جامعیت اور انتہائی منطقی ربط کے ساتھ اس سورۂ مبارکہ میں سمو دیا گیا ہے۔

۴۔ چوتھی اور آخری تمہیدی بات یہ کہ یہ سورۂ مبارکہ قرآن حکیم میں "سہلِ ممتنع" کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ ہر زبان کے ادب میں سب سے اعلیٰ شہ

پارے ان کو سمجھا جاتا ہے جن میں زبان آسان ہوتی ہے لیکن مضامین بلند ادا ہوتے ہیں۔ بھاری بھرکم الفاظ کے ذریعے بلند مضامین کو ادا کرلینا آسان ہے' لیکن سہل اور آسان زبان میں بلند اور اعلیٰ مضامین کو بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ چنانچہ سہلِ ممتنع ہونے کے اعتبار سے سورۃ العصر نقطۂ عروج پر ہے۔ اس میں کوئی لفظ مشکل نہیں آیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ان تمام الفاظ سے عام اردو دان شخص بھی بخوبی واقف ہے۔ ہمارے یہاں کی کتابی اردو میں یہ تمام الفاظ مستعمل ہیں۔ "اَلْعَصْر" عصرِ حاضر' عصرِ رواں' ہم عصر لوگ' ہم بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اسی طرح انسان' خسارہ یا خسران' ایمان' عمل' صالح یہ تمام الفاظ بھی ہمارے یہاں معروف و مشہور ہیں۔ ان کا مفہوم اور ان کے معنی ہر معمولی پڑھا لکھا شخص بھی جانتا ہے۔ صرف ایک لفظ ایسا ہے جس کو سمجھنے میں کچھ دقت ہو سکتی ہے اور وہ "تَوَاصَوا" ہے' لیکن اگر یہ معلوم ہو کہ یہ لفظ "وصیت" سے بنا ہے تو یہ اردو زبان ہی کا لفظ ہے' جس کے معنی ہیں نہایت تاکیدی نصیحت۔ پھر "حق" اور "صبر" کے الفاظ ہیں۔ الغرض کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو ہمارے لئے نامانوس ہو۔

عبارت کا تجزیہ

اب ہم اس سورۂ مبارکہ کو بحیثیتِ کل اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات پیش نظر رہے کہ اگرچہ اس کی آیات تین ہیں' لیکن قواعد کی رو سے یہ ایک ہی جملہ ہے اور اس میں نہایت سلیس انداز اور اسلوب سے ایک مضمون سامنے آ رہا ہے' جس کو آپ ایک سادہ بیان (SIMPLE STATEMENT) سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ پہلی آیت میں ایک قسم ہے: ﴿وَالْعَصْرِ﴾ اب ظاہر بات ہے کہ جب تک قسم کے بعد یہ بات سامنے نہ آئے کہ قسم کس بات پر کھائی گئی تو بات پوری نہیں ہوتی۔ آخری آیت میں ایک استثناء ہے: ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾ استثناء کے ساتھ جب تک مستثنیٰ منہ نہ ہو کہ کون سی بات سے استثناء کیا جا رہا ہے تو بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ تو جب پہلی آیت کو دوسری آیت کے ساتھ جوڑیں گے تو بات مکمل ہوگی اور تیسری آیت بھی درمیانی دوسری آیت کے ساتھ

ملحق ہو گی تب اس کا مفہوم واضح ہو گا۔ اس اعتبار سے جملہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ :

"زمانے کی قسم ہے کہ تمام انسان بہت بڑے خسارے میں ہیں' ماسوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے اور انہوں نے باہم ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور انہوں نے باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی"۔

ترجمہ سے اخذ کردہ چار نتائج

اس ترجمے کو ایک جملے کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھئے۔ اور اب میں چاہوں گا کہ آپ اس سے چار نتائج اخذ کر لیں اور ان شاء اللہ آپ کو ایسا محسوس ہو گا جیسے وہ بالکل سامنے کی بات ہے۔

۱۔ اس سے پہلا نتیجہ تو یہ سامنے آتا ہے کہ اس سورۂ مبارکہ میں انسان کی کامیابی و ناکامی کا ایک معیار بیان ہو رہا ہے۔ اس کی اہمیت پر آپ خود غور کر لیں کہ انسان کی ساری بھاگ دوڑ' تگ و دو' اس کی سعی و جہد' اس کی کوشش' درحقیقت اس کے کسی تصورِ کامیابی پر مبنی ہوتی ہے۔ ہر شخص کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے لیکن کامیابی کے تصورات میں فرق و تفاوت ہو گا۔ یہاں اس سورۂ مبارکہ میں خسارے سے بچنے اور کامیابی و کامرانی حاصل کرنے کا ایک تصور آ رہا ہے اور وہ یہ کہ خسارے سے بچنے والے صرف وہ لوگ ہیں جن میں یہ چار شرائط موجود ہوں۔ ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔

۲۔ دوسرا نتیجہ یہ اخذ ہوا کہ یہاں کامیابی کے اعلیٰ مراتب کا ذکر نہیں ہے بلکہ کامیابی کا جو کم از کم یعنی minimum درجہ ہے' یا یوں کہہ لیجئے کہ جو اس کے کم سے کم لوازم ہیں' ان کا بیان ہے۔ اس لئے کہ اگر مضمون یہ ہوتا کہ زمانے کی قسم ہے کہ وہ لوگ بہت اعلیٰ و ارفع مراتب حاصل کریں گے جن میں یہ چار شرطیں موجود ہوں' تو منطقی طور پر ایک امکان باقی رہتا کہ جن میں یہ چاروں باتیں نہ ہوں' ان چاہے کو اعلیٰ مراتب حاصل نہ ہوں لیکن کسی درجے میں کم سے کم سطح پر کامیابی حاصل ہو سکے گی۔ مگر چونکہ یہاں اسلوب یہ ہے کہ ﴿وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ○﴾ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہاں تو کامیابی کے ناگزیر لوازم کا بیان ہو رہا ہے۔

ایک مرتبہ میں ایک درس گاہ میں یہ مضمون بیان کر رہا تھا تو میں نے طلبہ کی مناسبت سے اس کو یوں ادا کیا کہ یہاں DISTINCTION یعنی امتیازی طور پر کامیابی کا بیان نہیں ہے' یہ فرسٹ ڈویژن یا سیکنڈ ڈویژن کا ذکر نہیں ہے بلکہ یہاں تو کامیابی کی آخری اور بنیادی سطح یعنی PASS PERCENTAGE کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہاں فوز و فلاح اور نجات و کامیابی کے ناگزیر لوازم بیان ہو رہے ہیں۔

۳ ۔ تیسرا نتیجہ اور وہ بہت اہم بات ہے' وہ یہ کہ یہاں قرآن حکیم انسان کی فلاح و کامیابی کو چار شرائط سے مشروط کر رہا ہے۔ ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ پس معلوم ہوا کہ یہ چاروں چیزیں لازمی ہیں۔ اتنی مختصر سورت' لیکن چار شرائط کا بیان!...... اس سے آپ اس بات کی طرف رہنمائی ہو رہی ہے کہ ان میں سے ہر شرط اپنی جگہ ناگزیر ہے۔ ویسے بھی آپ غور کریں کہ اگر کوئی حکیم 'کوئی ڈاکٹر کسی مریض کو نسخہ لکھ کر دے اور اس میں چار ادویہ تجویز کی گئی ہوں اور مریض اس میں سے ایک یا دو کو اپنی مرضی سے ساقط کر دے تو بالکل منطقی طور پر یہ بات سامنے آئے گی کہ اب یہ نسخہ اس حکیم اور ڈاکٹر کا نہیں جس نے اسے تجویز کیا تھا' اس کے نتائج کی ذمہ داری اس پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے جس نے اس میں ترمیم کی ہے۔ اس لئے قرآن حکیم بلکہ صحیح تر الفاظ میں خود اللہ تعالیٰ انسان کی کامیابی کے لئے اور خسران سے بچنے کے لئے چار شرائط بیان فرما رہے ہیں' تو ظاہر ہے کہ کسی اور کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ایک شرط کو بھی ساقط کر سکے۔

۴ ۔ چوتھا اور آخری نتیجہ یہ کہ یہاں انداز و اسلوب بیان نہایت تاکیدی ہے۔ عربی زبان میں تاکید کے جتنے اسلوب ممکن ہیں وہ سب اس سورۂ مبارکہ میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ یہی قرآن حکیم کا اعجاز بیان ہے کہ جس کے آگے عرب کے بڑے بڑے شعراء اور خطباء نے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ کتنی چھوٹی سی سورت ہے لیکن عربی زبان میں کسی بات پر زور دینے اور تاکید کے جتنے اسلوب بھی ممکن ہیں' وہ سب یہاں جمع ہو گئے ہیں۔ بات قسم سے شروع ہوئی' پھر حرف تاکید "اِنَّ" آیا۔ مزید حرف تاکید لام آیا (لَفِی) پھر "خُسْرٍ" نکرہ کی شکل میں آیا' یہ اس کی تفخیم ہے۔ پھر یہ جملہ اسمیہ ہے جس میں تاکید زیادہ

ہوتی ہے۔ الغرض جتنے بھی تاکید کے اسلوب ہیں ان کو یہاں جمع کر دیا گیا ہے تاکہ کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ اول تو یہ کلام اللہ ہے اور ع "مستند ہے ان کا فرمایا ہوا!" وہ قسم نہ بھی کھائے تب بھی اس کی ہربات' ہرلفظ' ہرحرف اور ہرشوشہ اٹل ہے لیکن ہمارے ذہنوں کے مطابق' ہماری تفہیم کے لئے' ہمارے قلوب پر اثر ڈالنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس سورۂ مبارکہ میں تاکید کے تمام اسلوب جمع فرمادیئے ہیں۔

سورۂ مبارکہ کا بطریقِ تدبّر مطالعہ

سورۃ العصر پر بطریق تذکر غور کرنے کے سے ہمیں اس سورۂ مبارکہ سے بنیادی رہنمائی' اصل نصیحت اور اس کا اصل سبق یہ حاصل ہوا کہ از روئے قرآن حکیم انسان کی فوز و فلاح اور اس کی کامیابی و کامرانی کی شرائط چار ہیں۔ ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ اب ہم اس سورۂ مبارکہ پر بطریقِ تدبر غور کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے اس سورۂ مبارکہ کو دو حصوں میں منقسم سمجھنا چاہئے۔ پہلا حصہ : ﴿وَالْعَصْرِ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۝﴾ اور دوسرا حصہ ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۝﴾ دوسری آیت چونکہ مرکزی آیت کے مقام کی حامل ہے لہٰذا وہ پہلی آیت سے بھی ملحق ہے اور تیسری آیت سے بھی۔ اس لئے وہ دونوں حصوں میں مشترک ہے۔

"والعصر" کا حقیقی مفہوم

اب پہلے حصہ پر نگاہوں کو مرتکز کیجئے۔ اس میں پہلی آیت ایک قسم پر مشتمل ہے : "وَالْعَصْرِ"۔ واؤ حرف قسم ہے' جیسے "وَاللّٰہِ" اللہ کی قسم ہے' ویسے ہی "وَالْعَصْرِ" زمانے کی قسم ہے۔ عصر کا جب ہم ترجمہ کرتے ہیں تو لفظ زمانہ سے کرتے ہیں۔ لیکن اب ذرا گہرائی میں اتر کر غور کیا جائے کہ "زمان" خود عربی کا لفظ ہے۔ اسے یہاں استعمال نہیں کیا گیا۔ کوئی خاص وجہ ہے کہ یہاں لفظ "عصر" آرہا ہے۔ ذرا مزید غور کیجئے۔ عربی زبان کے دو الفاظ بڑے عجیب ہیں : "دَھر" اور "عَصر"۔ ان دونوں میں اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے جسے انسان نے ابھی ماضی قریب میں سمجھا ہے۔ اور

وہ یہ کہ زمان و مکان دو جدا حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ time and space ایک ہی وحدت ہے۔ عربی زبان کے ان دونوں الفاظ میں زمان و مکان کی وحدت کی طرف اشارہ ہے' لیکن "دَھر" میں مکان کی وسعت کی طرف زیادہ توجہ ہے اور "عَصر" میں اس time and space complex کا زمانی عنصر (element) زیادہ پیش نظر ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے ان دونوں الفاظ سے قرآن حکیم میں دو سورتیں موسوم ہیں۔ سورۃ الدھر انتیسویں پارے میں اور یہ سورۃ العصر تیسویں پارے میں' جس پر اس وقت ہم غور کر رہے ہیں۔ سورۃ الدھر کا آغاز ہوتا ہے : ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا۝﴾ اور زیر مطالعہ سورت کے آغاز کی آیت ہے : وَالْعَصْرِ۔ دَھر اور عَصر میں جو بنیادی فرق سامنے آیا اب اس کے اعتبار سے غور کیجئے تو عصر کا ترجمہ ہو گا "تیزی سے گزرنے والا زمانہ"۔ جدید فلسفے میں جو وقت اور زمان کی بحث آتی ہے' اس میں آپ کو الفاظ ملیں گے SERIAL TIME جس سے مراد ہے زمانِ جاری۔ یہ وقت وہ ہے جو گزرتا ہے۔ اس میں ماضی' حال اور مستقبل کی تقسیم ہے۔ اور ایک ہے زمانِ مطلق یعنی ABSOLUTE TIME یا PURE DURATION جس میں گزرنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ عربی زبان میں اِعصار کہتے ہیں آندھی یا جھکڑ کو۔ دن میں عصر کا وقت وہ ہے جب کہ دن تیزی سے ختم ہو رہا ہوتا ہے۔ گویا پورا دن گزر چکا' تھوڑا سا وقت باقی ہے جو تیزی سے گزر رہا ہے۔ اب یہاں جب "وَالْعَصْرِ" کی ترجمانی کریں گے تو مفہوم ہو گا "تیزی سے گزرنے والا زمانہ گواہ ہے"۔ آپ غور کریں گے تو یہ وہ تصور ہے جو ہر زبان کے ادبِ عالیہ میں ملے گا۔ اردو کا بڑا پیارا شعر ہے۔

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

انگریزی میں بھی PSALM OF LIFE مشہور نظم ہے' اس کا ایک پیرا ہے۔

Art is long and time is fleeting
and our hearts though stout and brave
still like muffled drums are beating
funeral marches to the grave

یعنی "جس طرح کسی اہم فوجی شخصیت کا جنازہ ڈھول کی ہر ضرب کے ساتھ قبر سے نزدیک تر ہو جاتا ہے اسی طرح ہمارے دل کی ہر دھڑکن ہمیں قبر سے قریب تر کر رہی ہے"۔

اس سورۂ مبارکہ میں چونکانے اور جھنجھوڑنے کا انداز ہے۔ "وَالعصر" اے غافل انسان! تو اپنی غفلت میں زمانے کو ٹھہرا ہوا محسوس کرتا ہے' حالانکہ یہ وقت جو تیری اصل پونجی ہے' جو تیرا رأس المال ہے' جو تیرا اصل سرمایہ ہے' اسی میں تجھے بننا ہے جو کچھ بننا ہے' اور اسی میں تجھے بنانا ہے جو کچھ بنانا ہے۔ تیری یہ اصل پونجی برف کے مانند پگھلتی جا رہی ہے۔ یہ چونکانے کا انداز' نیند کے ماتوں کو بیدار کرنے کا انداز اس ایک آیت "وَالْعَصْرِ" میں مضمر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کے گمراہی کے بہت سے اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ وہ زمانے کی وسعتوں میں گم ہو جاتا ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اس گمشدگی کے عالم سے انسان کو نکالنے کے لئے یہ اسلوب نہایت بلیغ اور نہایت مؤثر ہے۔ ﴿وَالْعَصْرِ﴾ "زمانہ گواہ ہے!" کس حقیقت پر گواہ ہے؟ کس چیز پر گواہ ہے؟ اب اس کا ربط قائم ہوتا ہے دوسری آیت سے جو اس سورت کی درمیانی اور مرکزی آیت ہے۔ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝﴾ اس آیت میں "اِنَّ" حرف تاکید ہے۔ الف لام جو "اِنْسَان" پر داخل ہوا اس نے اس میں حصر کا مفہوم پیدا کر دیا یعنی "تمام انسان"۔ "خُسْرٍ" سے قبل لام پھر حرف تاکید ہے۔ "فِی" حرف جار ہے۔ "خُسْر" بہت بڑا خسارہ۔ اب دونوں آیتوں کے ربط سے ترجمانی یوں ہو گی کہ

"زمانہ گواہ ہے کہ بالیقین تمام انسان ایک خسران عظیم' ایک بہت بڑے گھاٹے اور ایک بڑی تباہی اور بربادی سے دوچار ہونے والے ہیں"۔

خسران کا وسیع مفہوم

پہلی دو آیات میں جو ایک خبر' اطلاع یا فیصلہ سامنے آیا' اب ذرا پوری توجہ اس پر

مرتکز کیجئے۔ کوئی حساس انسان اگر نوع انسانی کی کیفیات کا مشاہدہ کرے گا تو سب سے نمایاں جو حقیقت اس کے سامنے آئے گی وہ یہ کہ انسان بڑے بوجھوں تلے دبا ہوا ہے۔ بڑی مشقت' بڑی محنت اور طرح طرح کے مصائب اور مشکلات ہیں' جن سے ہر انسان دوچار ہے۔ انسانوں کی کثیر تعداد تو وہ ہے جس کو صبح سے شام تک کمر توڑ دینے والی مشقت کے باوجود دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ بے شمار انسان وہ ہیں کہ جن کے بچے ان کی آنکھوں کے سامنے دوا دارو کے بغیر دم توڑ دیتے ہیں' چونکہ ان کو اتنی مقدرت نہیں ہوتی کہ وہ بچوں کا علاج معالجہ کرا سکیں۔ پھر اس کو ہزاروں دکھ لگے ہوئے ہیں۔ کبھی یہ اولاد کی محبت میں تڑپتا ہے' کبھی مال کی تمنا اسے رلاتی ہے۔ کبھی کسی عزیز کی طرف سے اسے صدمہ پہنچتا ہے۔ کبھی اس کے جذبات کو کوئی ٹھیس لگتی ہے۔ طرح طرح کے مصائب و مشکلات سے یہ دوچار ہوتا ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ رنج و الم نوع انسانی کا مقدر ہے۔ اس کی طرف قرآن حکیم نے آخری ہی پارے کی سورۃ البلد میں کلیہ بیان فرمایا کہ ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ۝﴾ "یقیناً ہم نے نوع انسان کو محنت و مشقت ہی میں پیدا کیا ہے۔" اس آیت مبارکہ کی تفسیر ہر قلب حساس رکھنے والا شخص دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ غنیمت ہے کہ قلب حساس ہر انسان کو نہیں ملا ورنہ ایک نہیں لاکھوں گوتم بدھ انسان کے دکھوں کو دیکھ کر اس تہذیب و تمدن کی دنیا سے منہ موڑ کر جنگلوں میں جا دھونی رماتے۔ اس حقیقت کو مرزا غالب نے بھی نہایت خوبصورتی سے بیان کیا کہ۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

مزید غور فرمایئے۔ یہاں تک تو معاملہ صرف اتنا ہے کہ انسان کی حیثیت بھی بار برداری کے حیوان اور کولہو کے بیل کی سی ہے یعنی ہر ایک کے لئے محنت اور مشقت ہے۔ تھوڑا سا مزید فرق یہ ہے کہ انسان جذبات و احساسات بھی رکھتا ہے۔ اس کے جذبات کو بھی ٹھیس لگتی ہے' جبکہ لدو اونٹ یا کولہو کے بیل کے لئے یہ سوہان روح نہیں ہے۔ لیکن

انسان کے المیے کا نقطۂ عروج اصل میں وہ مرحلہ ہو گا جب وہ ساری مشقتیں جھیل کر اور ساری مصیبتیں برداشت کر کے دفعتاً اپنے مالک کے حضور پیش کر دیا جائے گا کہ اب جواب دہی بھی کرو کہ تم کیا کر کے آئے ہو۔ ہم نے تمہیں جو مہلتِ عمر دی تھی اس میں کیا بنایا؟ کیا کمایا؟ خیر کے کام کئے یا شر کے' نیکی کمائی یا بدی؟ ہماری طرف رخ رکھا یا دنیا ہی کو اپنا مقصود و مطلوب بنا لیا؟ ایک ایک فعل اور عمل کا حساب دو' ایک ایک قول کا حساب دو۔ ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝﴾ (ق : ۱۸) "کوئی لفظ اس (انسان) کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لئے ایک حاضرباش نگران موجود نہ ہو"۔ ظاہر بات ہے کہ یہ معاملہ انسان کا ہے' حیوان کا نہیں۔ انسان کو جو شرف ملا ہے اور اشرف المخلوقات کا جو مقام اسے حاصل ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ ذمہ دار اور جواب دہ ہے' RESPONSIBLE اور ACCOUNTABLE ہے' جس کا نقشہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں کھینچا ہے کہ ((لاتزولُ قدمُ ابنِ آدمَ یومَ القیامۃِ مِن عند ربّہٖ حتیٰ یُسْئَلَ عن خمسٍ)) کہ ابن آدم کے قدم قیامت کے روز اپنے رب کے حضور سے ہل نہ سکیں گے (وہ جواب دہی کے کٹہرے سے جنبش نہیں کر سکے گا) جب تک کہ اس سے پانچ باتوں کا جواب نہ لے لیا جائے گا۔ ((عَن عمرہٖ فیم افناہ)) اس کی عمر کے بارے میں کہ کہاں ضائع کی' کہاں کھپائی! دیکھئے سورۃ العصر کے ساتھ اس کا ایک گہرا تعلق ہے۔ ((وعَن شبابِہٖ فیم ابلاہ)) خاص طور پر عمر کا وہ حصہ جسے شباب کہتے ہیں' امنگوں کا دور' ولولوں کا دور' جبکہ جسم و جان میں حرارت اور توانائی ہوتی ہے۔ اپنی عمر کا وہ قیمتی حصہ کہاں ضائع کیا......؟ ((وعَن مالِہٖ من اینَ اکتَسَبَہٗ وفیم اَنْفَقَہ)) اور مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا' حلال سے یا حرام سے' جائز سے یا ناجائز سے؟ اور کہاں خرچ کیا؟ ادائے حقوق میں صرف کیا یا اللوں تللوں میں اور عیاشیوں اور بدمعاشیوں میں صرف کیا؟ اور آخری اور سب سے کٹھن سوال ہے ((وَمَاذا عَمِلَ فیما عَلِمَ)) اور جو علم حاصل ہوا اس میں عمل کتنا کیا؟ (یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے اور اسے امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے) ان میں سے ایک ایک کی جواب دہی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ انسان پکار اٹھے گا :

"يٰلَيْتَنِىْ كُنْتُ تُرَابًا" ہائے بد بختی! کاش کہ میں مٹی ہوتا۔ اسی وقت کے احساس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نسل انسانی کے گلِ سر سبد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ لرزتے اور کانپتے رہتے تھے۔ آنجنابؓ ایک عجیب کیفیت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے : کاش کہ میں ایک چڑیا ہوتا! درختوں پر چہچہانے والی چڑیا جس سے محاسبہ نہیں ہوگا' جس کو جواب دہی نہیں کرنی ہوگی۔ کاش! کہ میں گھاس کا ایک تنکا ہوتا جو جل کر نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے۔ اس کا محاسبہ نہیں' اس کے لئے جواب دہی نہیں۔

یہ ہے وہ معاملہ جس کو آخری ہی پارے کی ایک اور سورت میں بڑی شانِ جلال کے ساتھ فرمایا کہ ﴿ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ﴾ (الانشقاق) "اے انسان! تجھے یہ مشقتیں جھیل کر' محنتیں برداشت کر کے اور یہ تمام بوجھ اٹھاتے ہوئے بالآخر اپنے رب کے ساتھ ملاقات بھی کرنی ہے"۔ ایک وقت آئے گا جب تم اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہو گے اور تم کو جواب دہی کرنی پڑے گی۔ تمہارا محاسبہ ہو کر رہے گا۔ اس کی بڑی اچھی عکاسی اس شعر میں کی گئی ہے کہ ۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

یہ ہے وہ مرحلہ جس کے احساس کی شدت سے ایک شاعر پکار اٹھا کہ ؏ مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے! یعنی اے کاش! میری ماں نے مجھے جنا نہ ہوتا۔

یہ انسان کے المیے کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ہے۔ ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھئے اور پھر ان دو آیات پر توجہ کو مرتکز کیجئے کہ ﴿ وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِىْ خُسْرٍ ۝ ﴾ اس کے نتیجے میں ایک مایوسی کی سی کیفیت محسوس ہوگی۔ اسی کا علاج ہے جو آخری آیت میں ہمارے سامنے آئے گا۔ ایک استثناء ہے۔ گویا کہ انسان پکار کر سوال کر رہا ہے : اَيْنَ الْمَفَرُّ؟ کہیں اس خسران سے بچنے کی کوئی صورت ہے بھی کہ نہیں؟ اس خسارے سے بچاؤ کی کوئی شکل ہے کہ نہیں؟ اب اس کا جواب ہے جو اس سورۂ مبارکہ کی تیسری آیت میں دیا گیا ہے جو آخری آیت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ ﴾

چند ضمنی لیکن اہم مباحث

اس تیسری آیت پر گفتگو سے قبل چند ضمنی لیکن اہم باتوں کی طرف توجہ ہو جائے۔

۱۔ علامہ اقبال کا ایک مشہور شعر ہے۔

زمانہ ایک' حیات ایک' کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ قدیم و جدید

گویا انسان اور اس کے محرکات و میلانات اب بھی وہی ہیں جو پہلے تھے اور انسان کے اندر کی دنیا اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی۔ ساتھ ہی زمانہ اور اس کی وسعتیں اور اس کی شہادتیں بھی وہی ہیں جو پہلے تھیں۔ اگر ہم غور کریں تو زمانے کے متعلق ایسا محسوس ہوگا کہ جیسے ایک چادر ہے جو ازل سے ابد تک تنی ہوئی ہے اور اس میں کوئی رخنہ نہیں ہے۔ اور زمانے کی یہ چادر درحقیقت چشم دید گواہ قرار دی جا سکتی ہے ان اقوام و امم کے عروج و زوال اور ان کے ترفّع و تنزّل کے قصص کی جن کا قرآن حکیم میں ذکر ہے۔ اس طرح قرآن مجید میں جو تاریخی واقعات مذکور ہیں گویا آیت "وَالْعَصْرِ" میں ان کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔

۲۔ سورۃ العصر کا اپنے سے قبل اور بعد والی سورتوں کے ساتھ نہایت گہرا ربط و تعلق ہے۔ چنانچہ انسان جب اس زمانے میں گم ہو جاتا ہے اور حقائق پر اس کی نگاہ نہیں رہتی تو جو کیفیت ہوتی ہے اس کا نقشہ سورۃ التکاثر میں بیان کیا گیا ہے ﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ۝﴾ "تمہیں غافل کئے رکھا بہتات کی طلب نے"۔ جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ سورۃ العصر چونکا دینے کے انداز میں سامنے آتی ہے۔ آغاز ہی اس تنبیہ سے ہوتا ہے کہ تیزی سے گزرنے والا زمانہ گواہ ہے کہ مہلتِ عمر کسی آن ختم ہو سکتی ہے' تمہاری پونجی برف کے مانند پگھل رہی ہے' لہٰذا جاگو' ہوش میں آؤ۔ یہی اسلوب سورۃ التکاثر اور اس سے ماقبل کی سورۃ القارعہ کا ہے۔ پھر اس غفلت اور مال کی بہتات کی طلب کا جو عملی نتیجہ انسان کے اخلاق اور کردار میں گراوٹ اور پستی کی صورت میں نکلتا ہے' اس کا ذکر سورۃ الھمزۃ میں ہے : ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ۝ الَّذِي

جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ﴾ "تباہی اور بربادی ہے ہر اس شخص کے لئے جو لوگوں پر طعن اور چغلی کرنے کا عادی ہے (خواہ وہ منہ در منہ ہو خواہ پیٹھ پیچھے) جس نے مال سینت سینت کر اور گن گن کر رکھا"۔ اخلاقی اعتبار سے بھی پستی اور مالی اعتبار سے بھی بخل اور حرص' یہ چیزیں انسان پر مسلط ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں سورتوں یعنی التکاثر اور الھمزۃ کے درمیان سورۃ العصر نہایت حسین اور خوبصورت نگینے کی حیثیت سے جڑی ہوئی ہے۔ گویا آفاق میں گمشدگی اور اخلاقی پستی سے بچنے کی واحد صورت یہی ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کو حرزِ جان بنایا جائے۔

۳۔ عربی زبان میں خسارے سے مراد مالی نقصان اور گھاٹا بھی ہے۔ لیکن قرآن مجید نے عربی الفاظ کو اختیار کرکے اصطلاحات کی حیثیت دی ہے' چنانچہ قرآن کہیں کہے گا : ﴿ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴾ کہیں کہے گا : ﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ کہیں کہے گا : ﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ "اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کسی اور دین (نظامِ حیات و اطاعت) کو اختیار کرے تو اس کا یہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں اور ناکاموں میں شامل ہو گا۔ لہٰذا سورۃ العصر میں یہ لفظ (خُسْر) نہایت جامع مفہوم کے ساتھ آیا ہے۔ "خسر" دراصل فلاح' فوز اور کامیابی کی ضد ہے۔ ایک وہ شخص ہے جس نے خیر کے اس جذبے کو جو اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں ودیعت فرمایا تھا' صحیح رخ پر پروان چڑھایا اور خیر کے اعلیٰ اوصاف کے مطابق اپنی سیرت کی تعمیر کی۔ یہ شخص کامیاب ہوا اور یہی شخص اعلیٰ و ارفع انجام کو بھی پہنچا۔ ایک دوسرا شخص وہ ہے جس نے شر کا راستہ اختیار کیا' برائیوں کو اپنایا' بدی کمائی' تو ایسا شخص آخرت میں ناکام اور خاسر رہ گیا۔ اور چونکہ قرآن مجید کے نزدیک اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے ﴿ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ﴾ اور دنیا کی یہ زندگی محض برائے امتحان و آزمائش ہے ﴿ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ لہٰذا جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا گیا کہ خسارے' تباہی' بربادی اور نامرادی و ناکامی کا ذکر قرآن مجید کرتا ہے تو اس میں اصلاً پیشِ نظر آخرت ہی ہوتی ہے' دنیا اس کے تابع ہوتی ہے۔

چنانچہ سورۃ التغابن میں جو اٹھائیسویں پارے کی سورت ہے' فرمایا ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ "ہار اور جیت کے فیصلے کا اصل دن وہ یعنی آخرت کا دن ہے" اس دن معلوم ہو گا کہ کون حقیقتاً کامیاب و کامران رہا اور کون ناکام و نامراد اور خائب و خاسر رہا! باقی رہا یہ سوال کہ اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ دنیا میں بھی کامیاب ہو تو دنیا میں حقیقی کامیابی کے لوازم بھی وہی ہیں جو اس سورۂ مبارکہ میں بیان ہو رہے ہیں۔ ہم محض ظاہری چمک دمک سے اس مغالطے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ دنیا میں وہ لوگ جو قرآن پر ایمان نہیں رکھتے بڑی کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں' حالانکہ ان کے اپنے المیے اور اپنے مصائب ہیں' جن سے وہ شدت کے ساتھ دوچار ہیں۔ بقول علامہ اقبال مرحوم۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

راہ نجات کے سنگ ہائے میل

سورۃ العصر کی پہلی دو آیات کے نتیجے میں ایک گونہ ناامیدی اور مایوسی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی ۞ "زمانہ گواہ ہے کہ تمام انسان خسارے میں ہیں" ﴿وَالْعَصْرِ ۞ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۞﴾ اس ضمن میں فطری طور پر ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اس عمومی خسارے سے بچاؤ کی کوئی صورت ہے یا نہیں اور اس سے نجات کا کوئی راستہ بھی ہے یا نہیں؟ قرآن حکیم اسی سورۂ مبارکہ میں ہمیں بتاتا ہے کہ نجات کا ایک راستہ ہے۔ اس راستہ کو وہ "الصّراط المستقیم" کا نام بھی دیتا ہے' "سواء السَّبیل" بھی قرار دیتا ہے اور "الصِّراط السَّوِیّ" اور "قصدُ السَّبیل" بھی قرار دیتا ہے۔ قرآن حکیم میں مختلف الفاظ میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا کہ یہ ایک ایسا راستہ ہے جس پر چل کر انسان فوز و فلاح اور کامیابی و کامرانی سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ سورۃ العصر کی تیسری آیت میں اس راستے کے چند مقامات کا ذکر ہے جنہیں میں نے ابتداء میں ایک نسخے کے چار اجزاء سے تشبیہ دی تھی۔ ان پر جب ہم بطریق تدبر غور کریں گے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ وہ اسی راستے کے سنگ ہائے میل ہیں اور باہم لازم و ملزوم ہیں۔

اگر ایک شخص کسی راستہ پر چل رہا ہو تو پہلے ایک مقام آئے گا۔ آگے بڑھے گا تو دوسرا مقام آئے گا۔ کچھ اور آگے بڑھے گا تو تیسرا مقام آئے گا۔ مزید آگے بڑھے گا تو چوتھا مقام آئے گا۔ تو صراط مستقیم کے چار مقامات ہیں : (۱) ایمان (۲) عمل صالح (۳) تواصی بالحق اور (۴) تواصی بالصبر۔

ان چاروں کے مابین جو منطقی ربط ہے' پہلے اسے ایک بڑی سادہ مثال سے سمجھئے۔ ہمیں اپنی زندگی میں جن معاملات سے سابقہ پیش آتا رہتا ہے' اس میں اگر کوئی ایسا معاملہ سامنے آجائے جس میں کوئی نزاع یا جھگڑا ہو اور اس میں آپ کو حکم تسلیم کرلیا جائے تو عقلِ عام اور فطرت کے تقاضے کی رو سے جو پہلی چیز آپ پر لازم ہوگی' وہ یہ ہے کہ آپ پوری کوشش کر کے اصل حقیقت کو معلوم کریں اور اس معاملہ کی تہہ تک پہنچیں۔ دوسری بات اسی Common Sense کے تقاضے کے طور پر آپ پر یہ لازم ہوگی کہ جو حقیقت آپ کے سامنے آئے' وہ خواہ آپ کو پسند ہو یا ناپسند ہو' آپ اسے قبول کریں۔ پھر اگر آپ کے پاس سیرت و کردار کی پونجی ہے تو تیسرا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ اس حقیقت کا اعلان کریں' یہ دیکھے بغیر کہ یہ اعلان کسی کو پسند ہوگا یا ناپسند' کسی کو اچھا لگے گا یا برا' جو حقیقت آپ پر منکشف ہوئی ہے اس کا اعلان از روئے عقل و فطرت اور از روئے عدل و انصاف آپ پر واجب ہے۔ اگر کسی خوف سے دب کر یا کسی لالچ کے زیر اثر انسان اس حقیقت کا اعتراف و اعلان نہیں کرتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم فیصلہ کریں گے کہ اس شخص میں سیرت و کردار کی قوت موجود نہیں ہے۔ وہ ایک بودا' کمزور اور بزدل انسان ہے۔ چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ اگر اس حقیقت کے اعتراف و اعلان پر کوئی تکلیف آئے' کسی resentment اور کسی مخالفت و مزاحمت کا مقابلہ و مواجہہ کرنا پڑے' کسی تشدد اور persecution کو جھیلنا پڑے تو انسان کی سیرت و کردار کا اصل امتحان اور test یہی ہوگا۔ اگر وہ ثابت قدم رہتا ہے' جھیلتا اور برداشت کرتا ہے' تب ہی وہ ایک صاحب کردار انسان شمار ہوگا۔ اس کے برعکس معاملہ ہو تو عقل عام کا فیصلہ یہ ہوگا کہ یہ شخص بودا' تھڑدلا' کم ہمت اور بزدل ہے اور سیرت و کردار سے عاری اور تہی دست ہے۔

اب ان چیزوں کو ذہن میں رکھئے اور غور کیجئے کہ انسان کی نگاہوں کے سامنے جو

عریض و بسیط کائنات پھیلی ہوئی ہے' انسان جب شعور کی آنکھ کھولتا ہے تو اس کے سامنے سب سے پہلا مسئلہ یہ آتا ہے کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کائنات کی ابتدا اور انتہا کیا ہے؟ اس کا مبدأ و معاد کیا ہے؟ میں کون ہوں؟ میری زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ رہنمائی کہاں سے اخذ کروں؟ آیا صرف میرے حواس ہی میری رہنمائی کا واحد ذریعہ ہیں یا ان سے بالاتر عقل و شعور اور فکر و قیاس کی کوئی صلاحیت بھی میرے اندر ہے؟ آیا میں صرف عقل ہی سے رہنمائی اخذ کروں گا یا اس سے بالاتر ہدایت و رہنمائی کا کوئی ذریعہ بھی موجود ہے؟ خیر کیا ہے؟ شر کیا ہے؟ یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جو ہر انسان کے سامنے آتے ہیں بشرطیکہ وہ عقل و شعور کے اعتبار سے بالغ ہو۔ چنانچہ آپ کو علم ہو گا کہ یہی سوالات ہیں جن سے دنیا کے ہر خطے اور ہر دور میں فلاسفہ اور حکماء زور آزمائی کرتے رہے ہیں اور غلطاں و پیچاں رہے ہیں۔ انہی سوالات کو حل کرنے اور انہی گتھیوں کو سلجھانے کی تگ و دو میں انہوں نے اپنی پوری پوری زندگیاں کھپا دیں۔ ان سوالات کا ایک جواب وہ ہے جو بعض انسان اس دعوے کے ساتھ دیتے رہے ہیں کہ ہم تمہیں جو جواب دے رہے ہیں وہ ہمارے اپنے فکر اور ہماری اپنی سوچ اور ہمارے ظن و تخمین کا نتیجہ نہیں ہے۔ گویا یہ ہمارا خانہ زاد اور طبع زاد نہیں ہے' بلکہ ایک اعلیٰ ترین اور معتبر ترین ذریعہ علم ہے جس سے ہمیں یہ علم ملا ہے۔ اس کائنات کے خالق و مالک نے ہمیں ان سوالات کے جوابات بذریعہ وحی دیئے ہیں' جو قطعی اور حتمی ہیں' جن میں ظن و تخمین اور شک و شبہ کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ ہیں وہ حضرات گرامی جن کو ہم انبیاء کہتے ہیں اور رسل کے نام سے جانتے ہیں۔ فلاسفہ اور حکماء کے جواب میں آپ کو معلوم ہے کہ کہیں یقین کی کیفیت نہیں ہوتی۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہماری عقل "یہ" کہتی ہے' ہماری سمجھ میں "یوں" آیا ہے' ہمیں "ایسے" لگتا ہے۔ جبکہ انبیاء و رسل کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ ہم جو کہہ رہے ہیں وہ "الحق" ہے' لَا رَیْبَ فِیْہِ' اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ان لوگوں کی باتوں کو مان لینے کا نام اصطلاح میں ایمان ہے۔ انہوں نے جو حقائق بتائے' مابعد الطبیعیات کا جو حل انہوں نے پیش کیا' ان کی تصدیق اور ان کے اعتماد و اعتبار پر ان باتوں کو تسلیم کر لینے کا نام ایمان ہے۔

ایمان کے دو درجے

ازروئے قرآن مجید یہ ایمان انسان کی کامیابی کی پہلی منزل ہے' یہ شرطِ اول ہے' یہ وہ پہلا قدم ہے جس کے بارے میں ایک فارسی شاعر کہتا ہے کہ ع "شرط اول قدم این است کہ مجنوں باشی" اس کے بغیر آگے چلنے کا کوئی امکان نہیں۔ البتہ اس موقع پر یہ جان لیجئے کہ اس ایمان کے دو درجے ہیں۔ اس میں ایک تصدیق ہے زبانی اور لفظی۔ اور ایک تصدیق ہے قلبی۔ یہیں سے اب ہماری بات آگے بڑھے گی۔

ایمان جب تک صرف نوکِ زبان تک رہتا ہے اس کا امکان ہی نہیں گمانِ غالب رہتا ہے کہ انسان کے کردار میں اس کے اثرات ظاہر نہ ہوں۔ قول و فعل کا تضاد تو ہمیں اپنے معاشرے میں عام نظر آتا ہے۔ لیکن جب ایمان قلب کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور یہ تصدیق بالقلب کی شکل اختیار کرلیتا ہے تو اب اس کا کوئی امکان نہیں رہتا کہ انسان کے عمل میں' اس کے کردار میں' اس کی روش میں اور اس کے معاملات میں اس کے اثرات ظاہر نہ ہوں۔ چنانچہ یہی ہے وہ حقیقت جس کو نبی اکرم ﷺ نے بڑی وضاحت سے متعدد احادیث میں بیان فرمایا ہے جو بعد میں پیش کی جائیں گی۔ یہاں یہ پیش نظر رہے کہ زبانی اقرار والا ایمان قانونی ایمان ہے' جس کی بنیاد پر اس دنیا میں ہم کسی کو مسلمان سمجھتے ہیں' اس میں سارا دار و مدار اقرارٌ باللسان پر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ کسی کے قلب کی گہرائیوں میں اتر کر ہم نہیں دیکھ سکتے کہ ایمان موجود ہے یا نہیں۔ لیکن اصل ایمان دل کی گہرائیوں میں جاگزیں اور راسخ ہو جانے والا ایمان ہے۔ جیسے سورۃ الحجرات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِىْ قُلُوْبِكُمْ﴾ "مگر اللہ نے ایمان کو تمہارے لئے محبوب کردیا اور اس کو تمہارے دلوں میں کھبا دیا۔" آگے اسی سورۃ الحجرات میں فرمایا: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا، قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ﴾ "یہ بدو کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجئے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہوگئے ہیں۔ ابھی تک

ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا"۔ ایمان جب فی الواقع دل میں جاگزیں اور راسخ ہو جائے گا تو دنیا بدل جائے گی۔ جیسے علامہ اقبال نے کہا۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

ایمان کالازمی نتیجہ : عمل صالح

اس ایمان کے لازمی اثرات انسان کے اعمال و اخلاق پر مترتب ہوتے ہیں۔ یہ ہے حقیقی ایمان کا عمل صالح سے تعلق۔ اس تعلق کی تفہیم کے لئے میں چند احادیث پیش کرتا ہوں۔ پہلی حدیث کے راوی ہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ اور اسے امام بیہقیؒ شعب الایمان میں لائے ہیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ قَلَّمَا خَطَبنَا رسولُ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم اِلّا قال : ((لَا ایمانَ لمَن امانۃَ لہ' وَلا دینَ لمن لا عَہدَ لہ')) "شاذ ہی ایسا ہوا ہو گا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا ہو اور اس میں یہ بات آپ ﷺ نے نہ فرمائی ہو کہ جس شخص میں امانت داری کا وصف نہیں ہے' اس کا کوئی ایمان نہیں۔ اور جس شخص میں پاس عہد نہیں ہے' اس کا کوئی دین نہیں"۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں' اور یہ روایت متفق علیہ ہے یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے' کہ نبی اکرم ﷺ نے تین مرتبہ قسم کھائی : ((وَاللّٰہِ لا یُؤمن' وَاللّٰہِ لا یؤمن' واللّٰہِ لا یؤمن)) "اللہ کی قسم وہ شخص مومن نہیں ہے' اللہ کی قسم وہ شخص مومن نہیں ہے' اللہ کی قسم وہ شخص مومن نہیں ہے۔" آپ خود غور کر سکتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کس طرح لرز اٹھے ہوں گے کہ کون ہے وہ بدبخت انسان جس کے بارے میں حضور ﷺ تین مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر اس کے ایمان کی نفی فرما رہے ہیں! تو ڈرتے ڈرتے پوچھا گیا' قِیلَ : مَن یا رسولَ اللّٰہ "اے اللہ کے رسول ﷺ آپ کس کے بارے میں ارشاد فرما رہے ہیں؟" آنحضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا : ((الَّذی لا یأمَنُ جارُہ بَوائِقَہ')) "وہ شخص کہ جس کی ایذا رسانی سے اس کا پڑوسی امن میں نہیں ہے"۔ یہ ہے

ایمان کا تعلق عمل صالح سے۔ گویا یہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اگرچہ قانونی سطح پر یہ دو علیحدہ علیحدہ حقیقتیں (entities) ہیں لیکن حقیقت کی سطح پر یہ دونوں ایک وحدت ہیں اور ان کے مابین چولی اور دامن کا تعلق ہے۔

غور فرمایئے کہ آنحضور ﷺ نے کس قدر تاکید کے ساتھ اس شخص کے ایمان کی نفیِ کلی کا اعلان فرمایا ہے جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔ یہ وہ بات ہے جس کو ہم زیادہ سے زیادہ بداخلاقی پر محمول کرتے ہیں۔ یہ گناہ کبیرہ میں سے نہیں۔ شرک' قتلِ ناحق' زنا' سود خوری' چوری اور ڈاکے جیسے گناہوں میں سے نہیں ہے بلکہ صرف ایک معاشرتی اور اخلاقی برائی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کا عمل صالح سے کتنا گہرا ربط و تعلق ہے۔ ایک اور حدیث سن لیجئے۔ اس کے راوی بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ روایت بھی متفق علیہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ :

قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ : ((لَا یَزْنِی الزَّانِی حِینَ یَزْنِی وَھُوَ مُؤْمِنٌ' وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِینَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ' وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِینَ یَشْرَبُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ)) یعنی "کوئی بدکار حالتِ ایمان میں بدکاری نہیں کرتا اور نہ کوئی چور حالت ایمان میں چوری کرتا ہے اور نہ کوئی شرابی حالت ایمان میں شراب نوشی کرتا ہے۔" گویا ان گناہوں کا صدور ہوتا ہی اس وقت ہے جب کسی سبب سے حقیقی ایمان دل سے زائل ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس دنیا کے لحاظ سے قانوناً وہ مسلم و مومن ہی شمار ہو گا' اس کی تکفیر نہیں ہو گی' لیکن ایسا شخص حقیقی ایمان کی دولت سے محروم ہو جائے گا اور وہ اسے دوبارہ تب نصیب ہو گا جب وہ شعوری طور پر توبہ کرلے۔ پس معلوم ہوا کہ ایمان اور عمل صالح کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ بلکہ صحیح و درست عمل اور عمدہ اخلاق اور اعلیٰ کردار ایمان حقیقی کا لازمی جزو ہیں۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کا مستقل اسلوب یہ ہے کہ ایمان کے بعد اس کے لازمی نتیجہ کے طور عمل صالح کا ذکر ضرور ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سورۃ العصر میں ایمان کے بعد نجات اور فوز و فلاح کے حصول اور خسران سے بچنے کی دوسری شرط لازم کے طور پر عمل صالح کا ذکر کر دیا گیا۔ اس طرح آخرت کی کامیابی و کامرانی کے لئے صراط مستقیم کے اب تک دو سنگ ہائے میل

سورۃ العصر کے مطالعہ سے ہمارے سامنے آئے۔ پہلا ایمان اور دوسرا عمل صالح۔

عمل صالح کا تواصی بالحق سے تعلق

اب آگے چلئے۔ جب عمل صالح ایک انسان کی شخصیت اور اس کی سیرت میں پختگی کو پہنچتا ہے تو اس کا ایک منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ آس پاس کے ماحول میں نفوذ کرتا ہے۔ اگر انسان میں نیکی ہے اور فی الواقع ہے' یعنی وہ صرف نیکی کا ملمع نہیں ہے بلکہ حقیقتاً نیکی ہے تو ممکن نہیں ہے کہ نیکی ماحول میں سرایت نہ کرے۔ اگر آگ' آگ ہے صرف آگ کی صورت نہیں ہے تو ممکن نہیں ہے کہ اس سے ماحول میں حرارت نفوذ نہ کرے۔ یہیں سے عمل صالح کا منطقی تعلق "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ" سے قائم ہوتا ہے۔ یہ تو ایک طبعی قانون ہوا۔ لیکن اس ضمن میں دو چیزیں مزید قابل غور ہیں۔ پہلی یہ کہ انسان میں شرافت و مروت کی کوئی رمق موجود ہے تو عقل اور فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ جو بھلائی اسے میسر آئی ہے وہ اس میں دوسروں کو بھی شریک کرے۔ اگر کوئی اچھی بات آپ کے علم میں آئی' کوئی خیر آپ کو ملا' اور آپ نے اسے اپنی ذات تک محدود رکھا تو یہ بڑی خود غرضی ہوگی۔ شرافت و مروت اور انسان دوستی کا تقاضا ہے کہ آپ اسے پھیلائیں اور عام کریں اور دوسروں کو اس میں شریک کریں۔ یہی وہ بات ہے جو نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث میں آئی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: ((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ)) "تم میں سے کوئی شخص کامل مومن نہیں ہوگا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہیں کرتا جو اپنے لئے پسند کرتا ہے"۔ آگے بڑھئے تو ایک شے اور بھی ہے جس کا نام حمیت و غیرت ہے۔ اگر حق آپ پر منکشف ہوا تو اس کی غیرت و حمیت کا تقاضا یہ ہوگا کہ آپ اس کا پرچار کریں' اس کا بول بالا کریں' اس کے لئے جان کی بازی بھی لگانی پڑے تو اس سے دریغ نہ کریں۔ سقراط کا معاملہ ذہن میں رکھئے۔ کچھ حقائق اس پر منکشف ہوئے۔ اس نے ان کا پرچار شروع کر دیا۔ وقت کے معاشرے نے سقراط کی دعوت کو اپنے لئے خطرہ محسوس کیا۔ اقتدارِ وقت نے سقراط کے سامنے دو متبادل صورتیں (alternatives) رکھ دیں۔ یا ان باتوں کا پرچار روک دو' یا یہ زہر کا پیالہ ہے جو تمہیں

پینا پڑے گا۔ سقراط کا فیصلہ یہ تھا کہ انسان کا اس حالت میں زندہ رہنا کہ جو حق اس پر منکشف ہوا ہو وہ اسے بیان نہ کر سکے' اس سے بہتر یہ ہے کہ وہ زہر کا پیالہ پی کر اپنی زندگی قربان کر دے' چونکہ کوئی تیسرا alternative موجود ہی نہ تھا۔ پس غیرت و حمیت کا تقاضا یہی ہے کہ جو سچائی آپ پر منکشف ہوئی ہو اس کا واشگاف اعلان کیا جائے۔ یہ ربط و تعلق ہے "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کا "تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ" کے ساتھ۔ "اور وہ باہم ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرتے رہے" پس صراط مستقیم کا یہ تیسرا سنگِ میل ہے۔

ہمارے دین میں غیرت حق اور حمیتِ دینی کا کیا مقام ہے! اسے ایک حدیث سے سمجھئے جس کو امام بیہقی "شعب الایمان" میں لائے ہیں اور مولانا اشرف علی تھانوی نے جو خطباتِ جمعہ تالیف کئے ہیں' ان میں مولانا نے اسے شامل کیا ہے۔ گوش ہوش سے سنئے بڑی لرزا دینے والی حدیث ہے۔ قال رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" ((اَوحَی اللّٰهُ عزّ وجلّ اِلٰی جبریل علیه السلام اَنِ اقْلِبْ مدینةَ کذا وکذا بِاَهْلِهَا)) "اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کو حکم دیا کہ فلاں اور فلاں بستی کو اس کے رہنے والوں پر پلٹ دو"۔ ((قال فقال یا ربِّ اِنَّ فیها عبدَکَ فلانًا لم یَعْصِکَ طرفةَ عینٍ)) رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اس پر حضرت جبرئیل نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا "اے میرے رب! اس بستی میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے آنکھ جھپکنے کی مدت کے برابر بھی کوئی لمحہ تیری معصیت میں بسر نہیں کیا"! اب جگر تھام کر بارگاہ خداوندی کا فیصلہ سنئے ((قال فقال: اِقْلِبْهَا عَلَیهِ وعَلَیهِم فاِنَّ وجهَهٗ لم یتمعّر فیَّ ساعةً قطّ)) رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اس بستی کو پہلے اس پر الٹو اور پھر دوسروں پر' اس لئے کہ میری غیرت و حمیت میں اس کے چہرے کا رنگ ایک دفعہ بھی متغیر نہیں ہوا"۔ میں جب بھی یہ حدیث سناتا ہوں خود مجھ پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ ذرا اس شخص کی نیکی کا تصور کیجئے جس کے بارے میں گواہی دی جا رہی ہے کہ اس نے پلک جھپکنے جتنی دیر بھی معصیت میں بسر نہیں کی۔ پھر اس پر غور کیجئے کہ گواہی دینے والے کون ہیں! حضرت جبرئیل جن کی امانت و صداقت کی خود اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں گواہی دی ہے۔ ﴿ذِی

قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۝ مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ۝ ﴾ لیکن انفرادی طور پر اس قدر نیک ہونا بھی اس شخص کے کام نہ آیا کیونکہ اس نے تواصی بالحق کی ذمہ داری ادا کرنے میں غفلت اور بے پروائی اختیار کی تھی۔ گویا اخروی فوز و فلاح اور کامیابی و کامرانی کی تیسری شرط لازم تواصی بالحق ہے۔

تواصی بالحق اور تواصی بالصّبر کا باہمی ربط

اب آخری شرط کا بیان رہ گیا۔ یہ بات تو بہت ہی سادہ ہے۔ ایک عام کہاوت ہے "الحقُّ مُرٌّ" حق کڑوا ہوتا ہے۔ سچی بات سننا لوگوں کو عموماً پسند نہیں ہوتا۔ چھوٹی سی چھوٹی سچائی کا بھی اگر آپ اعلان کریں گے تو ہو سکتا ہے کہ کسی کو وہ بری لگے اور آپ کو اس کی طرف سے آزردگی (resentment) اور انتقامی کارروائی (retaliation) کا سامنا کرنا پڑے۔ پھر اگر "حق" کو محدود معنی میں نہ لیا جائے بلکہ اپنے جامع اور گھمبیر معنی میں لیا جائے جیسا کہ فی الواقع ہے، تب تو منطقی طور پر "تواصی بالحق" کا مطلب ہر نوع کے ظلم اور ہر قسم کی بے انصافی کے خلاف کھلا اعلانِ جنگ ہو گا۔ اب غور کیجئے کہ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ اس کا مالکِ حقیقی اللہ ہے۔ یہ زمین اللہ کی ہے، اس پر اسی کا حکم چلنا چاہئے۔ یہی مطلب ہے "اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" اور "اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ" کا۔ گویا کوئی شخصِ واحد ہو یا کوئی قوم حتیٰ کہ پوری نوع انسانی بحیثیتِ مجموعی بھی اس مالکِ حقیقی کے حکم کو پس پشت ڈال کر اگر اپنی مرضی چلائے تو وہ باغی ہے۔ ایسے تمام لوگ مفسدین شمار ہوں گے۔ ان کے خلاف حق کا پرچار کرنا، حق کا بول بالا کرنے کے لئے سعی و جُہد کرنا ہر اس شخص پر لازم، واجب اور فرض ہے جو مدعئ ایمان ہو۔ اگر ایسا انسان اس مقصد کے لئے کھڑا ہو جائے تو ظاہر بات ہے کہ اب "صبر" کا مرحلہ شروع ہو گا۔ جھیلنے اور برداشت کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ یہاں تک کہ اگر اس راہ میں جان چلی جائے تو اس کے لئے بھی آمادہ اور تیار رہنا ہو گا۔ جیسا کہ آغاز میں عرض کیا گیا تھا، یہ ہے وہ مقام جہاں انسان کی سیرت اور اس کے کردار کا اصل امتحان ہوتا ہے۔ اس امتحان میں حقیقی ایمان اور یقین کا وافر سرمایہ رکھنے والے ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ایسے لوگ خود بھی صبر کا

دامن تھامے رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی صبر کی روش پر جم جانے کی تاکید و نصیحت کرتے ہیں۔

الغرض یہ ہیں وہ نجات کی چار ناگزیر شرائط' فوز و فلاح کے چار ناگزیر لوازم۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر قرآن حکیم کے مضامین کا جائزہ لیا جائے تو یہی چار مضامین آپ کو بتکرار واعادہ ملیں گے' ان ہی کی تفصیلات و تشریحات ملیں گی۔ قرآن مجید میں یا ایمان کے تفصیلی مباحث ہیں' یا اعمالِ صالحہ کی تفصیلی بحثیں ہیں' یا امربالمعروف و نہی عن المنکر' جہاد و قتال فی سبیل اللہ' شہادتِ حق علی الناس' دعوتِ حق اور صبر و مصابرت کی بحثیں ہیں۔ ایک پانچویں چیز آپ کو قرآن حکیم میں امم سابقہ اور سابق انبیاء و رُسل کے واقعات و حالات کی صورت میں ملے گی۔ اس کی طرف اسی سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت "وَالْعَصْرِ" میں اشارہ موجود ہے۔ گویا سورۃ العصر کی حیثیت اس بیج کی سی ہے جس میں "بالقوہ" پورا قرآن موجود ہے اور جس طرح آم کی گٹھلی میں potentially پورا آم کا درخت موجود ہوتا ہے بالکل اسی طرح سورۃ العصر میں قرآن کی تمام تعلیمات کو سمو دیا گیا ہے اور یہی واحد توجیہہ ہے امام شافعی کے اس حکیمانہ قول کی کہ لو تدبّر النّاسُ هٰذِهِ السُّورَةَ لَوَسِعَتْهم "اگر لوگ صرف اس ایک سورت پر تدبر اور غور و فکر کریں تو یہ ان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کافی ہو جائے گی۔"

الحمد للہ سورۃ العصر پر گفتگو ایک حد تک مکمل ہو گئی ہے۔ اگرچہ یہ سورۂ مبارکہ اتنی گمبھیر اور profound' اتنی غامض و عمیق اور اتنی بصیرت افروز ہے کہ مزید کتنی بھی گفتگو ہو ہم سیری محسوس نہیں کریں گے کہ ہم نے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ تاہم جیسا کہ آغاز میں عرض کیا گیا تھا اس سورۂ مبارکہ کا جو اصل حاصل اور لبِّ لباب ہے یا اس کا جو اصل سبق ہے اور عملی رہنمائی ہے وہ ہمیں آخری آیت سے حاصل ہو جاتی ہے' یعنی یہ کہ ہم جان لیں کہ ازروئے قرآن مجید کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح چار شرائط سے مشروط ہے : (۱) ایمان (۲) عمل صالح (۳) تواصی بالحق (۴) تواصی بالصبر۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں میں شامل فرمائے جو ان چاروں شرطوں کو پورا کرنے والے ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین ○○

خلافت کی اصل حقیقت اور اس کا تاریخی پس منظر
اور عہد حاضر میں اس کے دستوری و قانونی اور معاشی و معاشرتی ڈھانچے اور اس کے
قیام کے لئے سیرت نبویؐ سے ماخوذ طریق کار کی تشریح پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد

داعی تحریک خلافت پاکستان
کے چار جامع خطبات کا مجموعہ' بعنوان :

خطبات خلافت

سفید کاغذ' صفحات : 212' قیمت : 50روپے

شائع کردہ : مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

1924ء میں خلافت کی تنسیخ کے بعد سے 1969ء تک
عالم اسلام کے کسی متحد نظام یا ادارہ کے قیام کی مساعی کے جائزہ پر مشتمل ایک تاریخی
دستاویز جو گوشہ خلافت کے عنوان سے ندائے خلافت میں بالاقساط شائع کی جاتی رہی

استنبول سے رباط تک

تالیف :
عمران این حسین

ترجمہ و تلخیص از محمد سردار اعوان

تقدیم از قلم ڈاکٹر اسرار احمد

سفید کاغذ' صفحات : 110' قیمت : 30روپے

شائع کردہ : مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور